امیر المومنین کے سیاسی افکار نہج البلاغہ کی روشنی میں

رضا عباس علوی

نہج البلاغہ کا بیشتر حصہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی حیات طیبہ کے اس دور سے متعلق ہے جس میں آپ بظاہر خلیفہ وقت کی حیثیت سے امت مسلمہ کے نظم ونسق کے ذمہ دار تھے اور اسلامی سیاست کو اس کے حقیقی مفہوم سے نزدیک تر کرنے کی سعی پیہم کر رہے تھے۔ آپ نے تمام خطبات اور مکتوبات میں عرفانی اور الہیاتی مباحث کے بعد سماجی اور سیاسی، مسائل پر سب سے زیادہ اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ آپ نے اپنے خطبات اور نہج البلاغہ میں اپنے ارشادات کے ذریعہ اسلامی سیاست کے نقوش اس قدر واضح کردیئے ہیں کسی شک وشبہہ یا ابہام کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

امیر المؤمنین کے سیاسی افکار نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر قوموں کو بھی حیرت میں ڈال دیتے ہیں صرف مسلمانوں میں ہی نہیں بلکہ دیگر قوموں میں انھیں بلند اسلامی اقدار یعنی عدل، مساوات اور اجتماعی آزادی کا عکس نظر آتا ہے جنھوں نے جزیرہ نمائے عرب میں عظیم ترین فکری اور ثقافتی انقلاب برپا کیا۔ امیر المومنین حضرت علیؑ بذات خود اسلامی اقدار کی ایک جیتی جاگتی تصویر اور قرآنی تعلیمات کا ایک عملی مجسمہ تھے اسی لئے آپ کے تمام سماجی، اخلاقی اور سیاسی افکار قرآنی تعلیمات کے سانچے میں ڈھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اپنے پانچ سالہ مختصر دور حکومت کے دوران جو مخالفین کی شر انگیزیوں سے بھرا ہوا تھا، امیر المومنین نے پوری شدت کے ساتھ عدل الٰہی کے سیاسی نقوش اجاگر کردیئے ہیں۔ حکومت کو کن صورتوں میں قانونی حیثیت حاصل ہوتی ہے؟ اسلامی سیاست کی روشنی میں حکام اور رہبروں کی خصوصیات کیا ہیں؟ حکومت اسلامی کے ارکان کس طرح کے ہونے چاہئیں؟ حکومت اور عوام کے درمیان کیسا ربط ہونا چاہئے؟ حکومت اور عوام کے باہمی حقوق کیا ہیں؟ اسلام کے سیاسی نظام میں عدل کی کیا اہمیت ہے؟ یہ وہ موضوعات ہیں جن پر امیر المومنین نے اپنے خطبات میں بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے اور اسلامی سیاست کے حدود اربعہ کا تعین کیا ہے۔

کلام امیر المومنینؑ کے ذریعہ ایک غیر متعصب قاری کو اسلامی طرز حکومت کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے اور اس پروپیگنڈے کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ اسلام میں سیاست تابع دین ہے، دین تابع سیاست نہیں۔ امیر المومنینؑ کے مقابلے میں صف آرا ہونے والی حکومت شام کے نزدیک سیاسی مفاد کے سامنے کسی انسانی اور خدائی قانون کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ ایسی بے دین حکومت کی موجودگی سے امیر المومنین کی اصول پسندی اور الٰہی سیاست کے نقوش اور زیادہ ابھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔

سیاست کی تعریف اور حاکم کی ضرورت

قدیم و جدید ماہرین علم سیاست کے مطابق سیاست کے اصل معنیٰ معاشرے کا نظم ونسق ہے۔ انسانی تاریخ کے ہر دور میں معاشرے کا نظم ونسق اور اس کے اجتماعی نظام کی دیکھ بھال کا مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اس سلسلے میں بہت وسیع پیمانے پر نہ صرف بحث کی گئی ہے بلکہ بڑی محنت و کاوش کے ساتھ ایک خصوصی دستور العمل بھی تیار کیا گیا ہے۔ دنیا میں قدیم زمانے سے آج تک معاشرے کے نظم ونسق کے لئے مختلف سیاسی نظام رائج رہے ہیں جس میں حاکم کی ایک کلیدی حیثیت رہی ہے۔ امیر المومنین حضرت علیؑ نے بھی نہج البلاغہ میں متعدد مقامات پر معاشرے کے انتظامی امور کے لئے ایک حاکم کی ضرورت کا ذکر کیا ہے:

''حضرت علی علیہ السلام نے خوارج کا قول (حکم صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے) سنا تو فرمایا: یہ جملہ تو صحیح ہے مگر اس سے باطل مراد لیا گیا ہے۔ ہاں بے شک حکم اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے، لیکن یہ لوگ تو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حکومت بھی صرف اللہ ہی کے لئے ہے۔ جبکہ لوگوں کے لئے ایک حاکم بہر حال ضروری ہے۔ خواہ وہ اچھا ہو یا برا (اگر حاکم اچھا ہوگا تو) مومن اس کی حکومت میں آزادی سے اپنے فرائض پر عمل کر سکے گا۔ اور اگر (برا ہوگا تو) کافر اس کے عہد میں لذتوں سے بہرہ اندوز ہوگا اور اللہ اس نظام حکومت میں ہر چیز کو اس کی آخری حدوں تک پہنچا دے گا اسی حاکم کی وجہ سے مال جمع ہوتا ہے، دشمن سے جنگ کی جاتی ہے، راستے پر امن رہتے ہیں اور قوی سے کمزور کا حق دلایا جاتا ہے یہاں تک کہ نیک حاکم مر کے راحت پائے اور برے حاکم کے مرنے پر دوسروں کو راحت پہنچے''۔ (خطبہ ۴۰)

ان سطور سے واضح ہے کہ امیر المومنینؑ حضرت علی علیہ السلام کی نظر میں امت اور معاشرے کے انتظامی امور کو سنبھالنے کے لئے ایک حاکم کا ہونا ناگزیر ہے جس کی غیر موجودگی سے سماج میں بدامنی اور انتشار کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے سے پہلی خلافتوں کو حق بجانب نہ سمجھتے ہوئے

بھی امیر المومنین نازک وقت میں امت مسلمہ کے مفاد کی خاطر خلیفۂ وقت کی مدد کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ آپ نے ہر مشکل وقت میں خلفاء کو انتہائی مفید مشورے دیئے یہاں تک کہ خلیفہ ثانی نے ایک موقع پر کہا کہ اے اللہ مجھ پر کوئی مشکل ایسی نہ ڈالنا جس کے حل کے لئے ابوالحسن موجود نہ ہوں۔

امام علی علیہ السلام کے کلام کے مطابق حاکمیت مطلقہ تو صرف خالق کائنات کے لئے ہے، مگر قانون اور اس کے نفاذ، امرونہی اور معاشرے کی کلی سیاست کی تشکیل کے لئے ایک سربراہی، سرپرستی اور رہبری کا ہونا ضروری ہے اور کوئی معاشرہ اس سے بے نیاز نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی بھی معاشرہ بغیر رہبر کے اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتا۔ امام حضرت علی علیہ السلام کے مطابق رہبری ایسی ہونی چاہئے جو معاشرے میں امن و امان قائم کرے، مظلوموں کی حمایت اور ظالموں کی سرکوبی کرے، مختلف ٹیکسوں کے ذریعہ مال جمع کرے اور اسے رفاہ عامہ کے کاموں میں خرچ کرے اسی کے ساتھ وہ معاشرے کے افراد میں اتنی شجاعت و توانائی پیدا کرے تاکہ دشمن ان کی جانب آنکھ نہ اٹھا سکیں۔ اس کے ساتھ آپ فرماتے ہیں کہ نیک حاکم وہ ہے جسے مرنے کے بعد ہی راحت میسر ہوتی ہے جب کہ برے حاکم کے مرنے پر عوام راحت کا احساس کرتے ہیں۔ امیر المومنین کے مطابق نیک حاکم خداوند عالم کے نزدیک عظیم جزاء کا حقدار ہوتا ہے جبکہ برا حاکم بدترین عذاب کا۔ اسی بات کی جانب آپ نے ایک مقام پر اشارہ فرمایا ہے ''آگاہ رہو کہ اللہ کے بندوں میں اس کے نزدیک سب سے افضل وہ حاکم عادل ہے جو خود ہدایت یافتہ ہو اور دوسروں کی ہدایت بھی کرے۔ بہترین اور معروف سنتوں کو زندہ اور مستحکم کرے اور بدعتوں کو دفن کرے۔ اور اللہ کے نزدیک لوگوں میں سب سے بدتر وہ ظالم حکمراں ہے جو بذات خود گمراہی میں پڑا رہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے، رسولؐ سے حاصل کی ہوئی سنتوں کو تباہ و برباد کرے اور متروک بدعتوں کو پھر سے زندہ کرے۔

میں نے رسولؐ اللہ سے سنا ہے کہ قیامت کے دن ظالم حاکم کو اس طرح لایا جائے گا کہ نہ اس کا کوئی مددگار ہوگا اور نہ کوئی عذر خواہ۔ اسے سیدھے جہنم میں ڈھکیل دیا جائے گا اور وہ اس میں اس طرح چکر کھائے گا جس طرح چکی گھومتی ہے پھر اسے جہنم کی گہرائی میں ڈال دیا جائے گا۔ (خطبہ ۱۶۴)

اسلامی اور دنیاوی سیاستوں کا فرق

موجودہ دور میں لفظ ''سیاست'' اور ''سیاست داں'' اپنے اصل معنی کھو چکے ہیں اور سردست لفظ سیاست کو مکروفریب، جعل سازی، خود پسندی اور ابن الوقتی کا مترادف سمجھا جانے لگا ہے مگر حقیقی بات

یہ ہے کہ ''سیاست'' کا یہ کریہہ مفہوم کوئی آج کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ دور قدیم ہی سے اہل حکومت و اہل سیاست نے جس طرح عوام الناس کے مفاد اور حقوق کو پامال کیا اور انھیں مسلسل خون سے نہلایا اس سے تاریخ کی کتابیں بھری ہیں۔ حکومتوں نے ہمیشہ سے عوام کو اپنے ظلم اور قتل و غارت گری کا نشانہ بنایا اور ان پر مشکلوں کے ایسے پہاڑ توڑے جنھیں لفظوں میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ تاریخ نے یہ منظر دنیا کے ہر خطے میں دیکھا کہ ایک مرتبہ تختِ اقتدار تک پہنچنے کے بعد حاکموں نے رعایا کے تمام حقوق کو درکنار رکھتے ہوئے ہوسنا کی، شہوت پرستی اور درندگی کا ایسا بازار گرم کیا جس کا خاتمہ ان کی زندگی کے ساتھ ہی ہوا۔ ایک جملے میں اگر کہا جائے تو دنیاوی سیاست ''کسی بھی ذریعہ سے اقتدار کا حصول اور اس سے لطف اندوز ہونے'' سے عبارت ہے۔ تاریخ کے بڑے بڑے ماہرین سیاست جیسے ''چانکیہ'' اور ''میکاولی'' نے بھی سیاست کا یہی نسخہ حاکم وقت کے لئے تجویز کیا ہے اور اگر کوئی اس پر عمل نہ کرے تو سیاست کے لئے نااہل، بیوقوف اور بدھو سمجھا جاتا ہے سیاست کے اسی پست معیار کے تحت بعض مورخین نے امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کو ناکام اور امیر شام معاویہ ابن ابوسفیان کی حکومت کو کامیاب قرار دیا ہے!

امیرالمومنین، جن کی شخصیت کا خمیر الٰہی پیغامات اور پیغمبر اسلامؐ کی بلند و بالا اخلاقی تعلیمات سے تیار ہوا تھا، اس مکروفریب اور غداری پر مبنی سیاست کے روادار کیسے ہوسکتے تھے جبکہ یہ چیزیں خود آپؑ ہی کے قول کے مطابق انسان کو کفر کی سرحد تک کھینچ لے جاتی ہیں۔ امیرالمومنینؑ کا آئینِ سیاست الٰہی مکتب فکر، علم و عرفان، انسانی فضائل و کمالات پر استوار تھا۔ امیرالمومنین کی سیاسی روش بشری فضل و کمال کی ایسی راہ معین کرتی تھی، جو تاریخ سیاست میں عالم انسانیت کے لئے ایک معیار و نمونہ بن جائے۔ اپنی اسی روش پر چلتے ہوئے امام حضرت علی علیہ السلام بڑی سے بڑی قربانی کیلئے بھی ہمیشہ تیار رہے۔ آپ نے ہمیشہ اپنی حکومت کو سیاسی بازی گری اور شخصی مصلحت پسندی سے اوپر رکھا اور اپنے پست مخالفین کو سیاسی اور شخصی مصلحت انگیزی سے اوپر رکھا اور اپنے پست مخالفین کے مقابلے کے لئے بھی اپنے معیار سے نیچے اترنے پر ہرگز تیار نہ ہوئے۔ ایک مقام پر آپ نے ارشاد فرمایا:

''خدا کی قسم معاویہ مجھ سے زیادہ چالاک (زیرک) نہیں، لیکن وہ مکروفریب اور فسق و فجور سے کام لیتا ہے اور اگر مجھے مکروفریب سے نفرت نہ ہوتی تو میں لوگوں میں سب سے زیادہ چالاک ہوتا لیکن ہر طرح کا مکروفریب ایک فاجرانہ عمل ہے اور ہر فاجرانہ عمل قیامت میں ہر ایک فریب کار کے لئے ایک

علامت اور پرچم ہوگا جس سے وہ پہچانا جائے گا۔ خدا کی قسم مجھے عیاری اور فریب کے ذریعہ غفلت میں نہیں ڈالا جاسکتا اور نہ حالات کی سختیوں سے دبایا جاسکتا ہے"۔ (خطبہ ۲۰۰)

ایک دوسرے مقام پر آپ نے ارشاد فرمایا:

"تم لوگ مجھ سے یہ چاہتے ہو کہ ملت پر ظلم و ستم کرکے فتح و کامرانی کی راہ تلاش کروں؟ خدا کی قسم جب تک ایک ستارہ دوسرے ستارے کے پیچھے چل رہا ہے میں اس کام کے قریب بھی نہ جاؤں گا"۔ (خطبہ ۱۲۶)

ایک سوال کا جواب

جس وقت امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھ پر مسلمانوں نے بیعت کی اور آپ نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو اس کے فوراً ہی بعد آپ نے معاویہ ابن ابوسفیان کو شام کی گورنری سے معزول کردیا جبکہ آپ کے کچھ مشیروں نے یہ مشورہ دیا کہ آپ معاویہ کو معزول کرنے میں عجلت سے کام نہ لیں جس نے ملک شام میں بیس برسوں سے اپنے پیر جما رکھے ہیں بلکہ ابھی چند دن توقف کرکے اپنی حکومت اور طاقت کو مضبوط کریں اس کے بعد آپ بے شک معاویہ کو معزول کردیں۔ یہ بے شک آپ کے اصحاب کا ایک مخلصانہ مشورہ تھا۔ ہر عقلمند انسان یہاں پر یہی سوچے گا کہ سیاست اور مصلحت کا تقاضہ یہی ہے کہ امامؑ کچھ دنوں تک معاویہ سے تعرض نہ کریں مگر امر واقعہ یہ ہے کہ امام نے اپنے اصحاب کا یہ مشورہ قبول کرنے سے انکار کردیا جس کے نتیجے میں جنگ صفین رونما ہوئی۔ یہاں سے اس بحث کا آغاز ہوتا ہے کہ اگر امیرالمومنینؑ کچھ دن رک کر اپنی طاقت اور قوت میں مزید اضافہ کرنے کے بعد حاکم شام کو معزول کرتے تو کیا یہ امت کے مفاد میں نہ ہوتا؟ کیا باطل کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کرنے کے لئے اسے کچھ دن اور برداشت نہیں کیا جاسکتا؟ یہ وہ سوال ہے جو دنیوی اہل سیاست اور مخلص دیندار دونوں طبقوں کی جانب سے پوچھا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ امیرالمومنینؑ کے عمل کو اس وقت تک نہیں سمجھا جاسکتا جب تک اسلامی سیاست میں آپ کی صحیح پوزیشن (Position) کو نہ سمجھا جائے۔ جسوقت آپ نے امیر شام کی معزولی کا حکم دیا اس وقت آپ صرف ایک حاکم وقت ہی نہیں خلیفۂ رسولؐ اور امام وقت بھی تھے۔ ایک الٰہی پیشوا اور خلیفۂ رسول ہونے کی حیثیت کے ساتھ آپؑ معاویہ کو جتنے دن یا یوں کہا جائے کہ جتنے منٹ کی مہلت دیتے تو وہ مہلت معاویہ کو حکومت کرنے کا شرعی جواز فراہم کرتی اور پچھلے تمام سیاہ کارناموں اور جرائم کے لئے

ایک خوبصورت پردہ ثابت ہوتی بعد میں آنے والے مورخ کا قلم یہی لکھتا کہ امیر شام معاویہ ابن ابو سفیان دوسری، تیسری اور چوتھی خلافت میں حکومت کرتے رہے اور بعد میں ان کی کچھ غلطیوں کی وجہ سے علیؑ نے انھیں عہدے سے معزول کردیا، یعنی یہ غلطیاں امیر شام کی پوری زندگی کے جرائم کے لئے ڈھال بن جاتیں اور ان کا بعد میں معزول ہونا گویا ایسا ہی ہوتا جیسے عام طور پر حکمراں گورنروں کو تبدیل کردیا کرتے ہیں۔

امام وقت ہونے کے ناطے امیرالمومنین حضرت علیؑ امیر شام کی حکومت کو شرعی جواز فراہم کرنے کے لئے قطعی طور پر تیار نہ تھے اسی کے ساتھ یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ امیرالمومنینؑ کی دور رس نگاہیں اپنے دور حکومت کے پاس دس برسوں کو نہیں بلکہ قیامت تک کے حالات کو دیکھ رہی تھیں، اگر کل علیؑ سیاسی مصلحت اور اپنی حکومت کو دوام دینے کی خاطر معاویہ کو کچھ دنوں کی مہلت دے دیتے تو آنے والے وقت کے سیکڑوں یا ہزاروں ''معاویہ صفت حکمرانوں'' کے لئے ایک بہترین بہانہ ہاتھ آجاتا اور وہ بھی باطل کے خلاف اقدام کرنے سے پہلے امیرالمومنینؑ کے اس عمل کو دلیل کے طور پر پیش کرکے اپنا سیاسی مفاد حاصل کرتے۔ امیرالمومنینؑ نے اپنے اس عمل سے اخلاقی سیاست کے ایسے بلند ستون تعمیر کئے جو ہزاروں برس تک عادل حکمرانوں کے لئے منارۂ نور ثابت ہوتے رہیں گے۔ اپنے اس عمل سے امیرالمومنینؑ نے شریعت کی سیاست پر بالادستی بھی ثابت کی یعنی سیاست کے تقاضوں پر شریعت کے تقاضوں کو قربان نہیں کیا جاسکتا اور کوئی بھی حاکم اپنی شرعی حکومت کے دوام کے لئے بھی غیرشرعی راستے نہیں اختیار کرسکتا۔ حکومت کے حصول اور دوام دونوں منزلوں پر علیؑ اخلاقی اصول اور شریعت کی قیمت پر کوئی سمجھوتہ کرنے پر تیار نظر نہیں آتے۔ یہاں پر وہ واقعہ بھی یاد کرنا چاہئے جب نبیؐ کی وفات کے بعد ابوسفیان ابن حرب حضرت کے پاس آکر کہتا ہے کہ دیکھو لوگوں نے دھاندلی مچا کر خلافت ایک تیمی (ابوبکر) کے حوالے کردی اور بنی ہاشم کو ہمیشہ کے لئے اس سے محروم کردیا، آپ ہاتھ بڑھائیں میں آپ کی بیعت کرتا ہوں اور اگر کوئی مخالفت کے لئے اٹھا تو میں مدینہ کے گلی کوچوں کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں گا۔ اگر اس نازک موقع پر علیؑ کا ایک مثبت اشارہ مل جاتا تو مسلمانوں میں فتنہ وفساد کے شعلے بھڑکنے لگتے۔ یہاں پر امیرالمومنینؑ نے اپنے آپ کو پیغمبرؐ کا صحیح وارث اور حقیقی جانشین سمجھتے ہوئے بھی صرف امت مسلمہ کے اتحاد کو پیش نظر رکھا۔ فتنہ و فساد کو ہوا دینے کے بجائے ابوسفیان کو سختی سے جھڑک دیا اور اس موقع پر یہ کلمات ارشاد فرمائے:

"اے لوگو فتنہ و فساد کی موجوں کو نجات کی کشتیوں سے چیر کر اپنے کو نکال لے جاؤ۔ تفرقہ اور انتشار کی راہوں سے اپنا رخ موڑ لو، فخر و مباہات کے تاج اتار ڈالو۔ صحیح طریقۂ عمل اختیار کرو کامیاب ہے جو اٹھے تو پر و بال کے ساتھ اٹھے اور نہیں تو دوسروں کے لئے چھوڑ بیٹھے اور اس طرح خلق خدا کو بدامنی سے راحت میں رکھے"۔ (نہج البلاغہ)

ان دونوں مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حکومت کا حصول یا دوام کبھی بھی امیرالمومنین کے لئے الٰہی احکام اور اصول کی قربانی کا موجب نہیں بنا بلکہ آپ نے ایسے موقع پر اپنے تدبر اور حکمت عمل کے ذریعہ الٰہی سیاست اور سنت پیغمبرؐ کے نقوش کو زندہ کیا۔

حکومت اسلامی کے قیام کا مقصد

امیرالمومنین حضرت علیؑ نے نہج البلاغہ میں جگہ جگہ پر حکومت اسلامی کے مقاصد پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ زمانۂ قدیم سے ہی زیادہ تر حکومتوں کے قیام کا مقصد عوام کا استحصال رہا ہے۔ شراب و کباب میں ڈوبی ہوئی داستانِ سیاست کی تاریخ میں ایسی حکومتیں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں جس کے سایہ میں عوام اور رعایا کے حقوق کی حفاظت کو اپنا مقصد حکومت قرار دیا گیا ہو۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ امیرالمومنینؑ کا تقریباً پانچ سالہ مختصر سا دور حکومت، سیاست کی تاریخ کا ایک زریں باب ہے جس میں حاکم کی تمام تر توجہ صرف رعایا اور اس کی بھلائی کی جانب مرکوز رہی۔ یہاں پر ہم حکومت اسلامی کے اغراض و مقاصد کے متعلق کلام امیرالمومنینؑ کے چند نمونے نقل کر رہے ہیں۔ ایک مقام پر امامؑ خداوند عالم کی بارگاہ میں تضرّع و زاری کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"پالنے والے! یقیناً تو ہی بہتر جانتا ہے کہ اس اقدام سے ہمارا مقصد حکومت و سلطنت سے لطف اندوزی یا دنیوی مال و دولت کی جمع آوری نہیں ہے بلکہ میں نے حکومت کا بار اپنے کندھوں پر صرف اس لئے اٹھایا ہے کہ اس کے ذریعہ تیرے دین کے شعائر کو دوبارہ زندہ کروں اور تیرے شہروں میں صلح و اصلاح کا ماحول سازگار کروں، تاکہ تیرے مظلوم اور ستم دیدہ بندے امن و امان سے رہیں اور تیرے معطل پڑے ہوئے قوانین نافذ ہو سکیں۔ پروردگار میں پہلا شخص ہوں جس نے سب سے پہلے تیری جانب رخ کیا، تیرے پیغام کو گوش دل سے سنا اور اس پر لبیک کہا، نماز کے سلسلے میں پیغمبر اسلامؐ کے علاوہ کوئی مجھ سے مقدم نہیں ہے"۔ (نہج البلاغہ خطبہ)

چند فقروں پر مبنی اس کلام میں امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے اسلامی حکومت کے

اغراض و مقاصد کے سبھی بنیادی عناصر کو سمیٹ لیا ہے، یہ چند جملے یقیناً امیرالمومنین کے سیاسی منشور کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے مطابق دینِ الٰہیہ کے نقوش کا احیاء احکام شریعت کے معاشرے میں نفاذ، فتنہ و فساد کا قلع قمع سماج کے مظلوم اور مستضعف افراد کی حمایت اور شہروں کا امن و امان اسلامی حکومت کے قیام کے بنیادی مقاصد قرار پاتے ہیں لیکن یہاں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رکھنی چاہئے کہ ایک کمزور حکومت کبھی بھی ان بلند مقاصد کو حاصل نہیں کرسکتی اس لئے آپ نے اپنی حکومت کے دوران کئی مرتبہ اس حقیقت کی جانب توجہ دلائی ہے اور امت کے قومی افراد سے معاشرے کے امن و امان کے لئے مفسدوں اور باطل پرستوں کے خلاف ہمہ وقت جنگ کے لئے تیار رہنے کی تاکید کی ہے۔

امیرالمومنینؑ کے مطابق ایک طاقتور اور جنگی لحاظ سے مضبوط حکومت ہی احکام الٰہی کا احیاء، فتنہ و فساد کا خاتمہ اور شہروں میں امن و امان قائم رکھ سکتی ہے۔ وہ عناصر جو حق سے بغاوت کرکے ان اغراض و مقاصد کو پس پشت ڈال دیں ان سے اس وقت تک جنگ کرنا لازم وضروری ہے جب تک وہ اللہ کی راہ پر پلٹ نہ آئیں اور قرآن کے حکم کے آگے گردنیں نہ جھکادیں تاکہ حق و عدل پھر سے قائم ہوسکے۔ اسی لئے آپ نے ایک مقام پر فرمایا:

''ان لوگوں کی طرف جنگ کے لئے چل پڑنے کو آمادہ ہوجاؤ جو حق سے بیگانہ ہوگئے ہیں اور اسے نہیں دیکھتے۔ ظلم وفساد میں مست ہوگئے ہیں اور اس سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ کتاب خدا سے دور اور صراط مستقیم سے منحرف ہوگئے ہیں''۔

امیرالمومنین کی سیاسی روش

امیرالمومنینؑ کا فلسفہ سیاست ایک جانب تو دنیاوی سیاست دانوں سے اس لئے الگ ہے کہ امیرالمومنین سیاست اور اقتدار کے لئے الٰہی اصولوں سے ذرہ برابر بھی سمجھوتہ کرنے کو تیار نظر نہیں آتے دوسری جانب آپ کا طرز حکومت نام نہاد دینی رہنماؤں کے اس آئیڈیلسٹ نظریے سے بھی پوری طرح الگ نظر آتا ہے جو ظالموں کے خلاف اقدام کو بھی غلط جانتا ہے، امیرالمومنینؑ کے فلسفۂ حکومت کے مطابق اگر کسی فرد یا گروہ کا وجود معاشرے کے امن و امان اور نظم ونسق کے لئے خطرہ بن جائے اور اصلاح کی کوششیں بیکار ہوجائیں تو ایسے افراد یا گروہ کی ایسی سختی کے ساتھ سرکوبی کی جائے کہ یا تو وہ اپنی شرانگیزیوں سے باز آجائیں یا صفحۂ ہستی سے ایک حرف غلط کی طرح مٹ جائیں ممکن ہے کہ کوئی تخیل پسند روحانی اور اخلاقی معلم ایسا ہو جو ظالموں کے قتل کو بھی گناہ سمجھتا ہو اس کی بزدل

روح اس خون کے سیلاب سے کانپ اٹھتی ہو جو دفع شر میں بہتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسا آئیڈیلسٹ معلم اخلاق اور رہنما دنیا کی اصلاح نہیں کرسکتا۔ وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں جاکر تقویٰ اور ریاضت سے اپنی روح کو تو ضرور تسکین پہنچا سکتا ہے مگر دنیا سے ظلم کو نہیں مٹا سکتا۔ جس طرح طب کا اصل مقصد اصلاح بدن ہے خواہ دوا کڑوی ہو یا میٹھی اسی رہنما کا اصل مقصد اصلاح معاشرہ ہے خواہ نرمی سے ہو یا سختی سے۔ ایک سچا مصلح صرف زبان سے معاشرے کی اصلاح کرنے کی قسم نہیں کھا سکتا۔ اپنا کام پورا کرنے کے لئے کبھی قلم اور کبھی تلوار کا استعمال اس کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے۔ امیرالمومنین نے اسی لئے متعدد مقامات پر اصلاح معاشرہ کے لئے اپنے اس مضبوط ارادے کا اظہار فرمایا ہے:

''خدا کی قسم میں اس بجّو کی طرح نہ ہوں گا جو لگاتار کھٹکھٹائے جانے سے سوتا ہوا بن جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا طلب گار (شکاری) اس تک پہنچ جاتا ہے اور گھات لگاکر بیٹھنے والا اس پر اچانک قابو پالیتا ہے بلکہ میں تو حق کی طرف بڑھنے والوں اور گوش برآواز اطاعت شعاروں کو لے کر ان خطا اور شک میں پڑنے والوں پر اپنی تلوار چلاتا رہوں گا یہاں تک کہ میری موت کا دن آجائے۔ خدا کی قسم! جب سے اللہ نے اپنے رسولؐ کو دنیا سے اٹھایا برابر دوسروں کو مجھ پر مقدم کیا گیا اور مجھے میرے حق سے محروم رکھا گیا''۔ (خطبہ نمبر۶)

''......میں نے اس قوم سے لڑنے کے لئے رات بھی اور دن بھی، اعلانیہ بھی اور پوشیدہ بھی تمہیں پکارا اور للکارا، اور تم سے کہا کہ قبل اس سے کہ وہ جنگ کے لئے بڑھیں تم ان پر دھاوا بول دو۔ خدا کی قسم جن افراد قوم پر ان کے گھروں کے حدود کے اندر ہی حملہ ہو جاتا ہے وہ ذلیل و خوار ہوتے ہیں لیکن تم نے جہاد کو دوسروں پر ٹال دیا اور ایک دوسرے کی مدد سے پہلو بچانے لگے یہاں تک کہ تم پر غارت گریاں ہوئیں اور تمہارے شہروں پر زبردستی قبضہ کرلیا گیا...... تمہیں ہلاک و تاراج کیا جارہا ہے مگر تمہارے قدم حملے کے لئے نہیں اٹھتے۔ وہ تم سے لڑبھڑ رہے ہیں اور تم جنگ سے جی چراتے ہو۔ اللہ کی نافرمانیاں ہورہی ہیں اور تم راضی ہورہے ہو......'' (خطبہ نمبر ۲۷)

''......اور اب بھی میرا اقدام ویسے ہی مقصد کے لئے ہے۔ تو سہی جو میں باطل کو چیر کر حق کو اس کے پہلو سے نکال لوں۔ میری قریش سے وجہ نزاع ہی اور کیا ہے۔ خدا کی قسم! میں نے تو ان سے جنگ کی، جبکہ وہ کافر تھے اور اب بھی جنگ کروں گا جبکہ وہ باطل کے ورغلانے میں آچکے ہیں اور

جس شان سے میں کل ان کے مقابلے میں ثابت قدم رہ چکا ہوں، ویسا ہی آج بھی رہوں گا''۔
(خطبہ نمبر ۳۳)

کلام امیر المومنینؑ سے ماخوذ مذکورہ بالا سطور سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ امیر المومنینؑ اپنے عہد اقتدار کے دوران اہلِ باطل اور فتنہ پردازوں کو کسی قسم کی مہلت یا ڈھیل دینے کے لئے تیار نہیں تھے بلکہ ان کے خلاف سخت ترین اقدامات کے لئے پوری طرح آمادہ تھے۔ آپ کی سیاست اور طرز حکومت احکام الٰہیہ کی طرح واضح اور روشن تھی جس میں کسی طرح کے ابہام اور تذبذب کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ آپ اس بات سے پوری طرح واقف تھے کہ چند ابن الوقت افراد اور بکے ہوئے محدثین اور مورخین آپ کی اس صاف ستھری سیاست کو ناشناسی پر محمول کرتے ہیں مگر آپ ان اعتراضات سے پوری طرح بے نیاز نظر آتے ہیں۔ ایک مقام پر آپ نے خود اپنے فلسفۂ سیاست پر نہایت وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے:

''مگر ہمارا زمانہ ایسا ہے جس میں اکثر لوگوں نے عذروفریب کو عقل و فراست سمجھ لیا ہے، اور جاہلوں نے ان کی (چالوں) کو حسن تدبیر سے منسوب کردیا ہے۔ اللہ انھیں غارت کرے انھیں کیا ہوگیا ہے؟! وہ شخص جو زمانے کی اونچ نیچ دیکھ چکا ہے اور اس کے ہیر پھیر سے آگاہ ہے وہ کبھی کوئی تدبیر اپنے لئے دیکھتا ہے، مگر اللہ کے اوامر ونواہی اس کا راستہ روک کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ تو وہ اس حیلہ و تدبیر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اس پر قابو پانے کے باوجود چھوڑ دیتا ہے اور جسے کوئی دینی احساس سدِ راہ نہیں ہے وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا لے جاتا ہے''۔ (خطبہ نمبر ۴۱)

اس مختصر سے کلام میں حضرت علی علیہ السلام نے اپنی سیاست کی اساس کا اظہار کرنے کے علاوہ ان لوگوں کو بھی جواب دیا ہے جو امیر شام کے مقابلے میں آپ کی سیاست کو ناکام ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ آپ دنیا کو یہ بتادینا چاہتے ہیں کہ تمام سیاسی ہتھکنڈوں، حیلہ و تدبیر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اس پر قابو پانے کے باوجود صرف اللہ کے اوامر و نواہی کے سدراہ ہوجانے کی وجہ سے آپ نے انھیں چھوڑ رکھا ہے۔ امیر المومنین اس حقیقت کو بھی واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہر حیلہ اور تدبیر کو عقل و فراست نہیں سمجھا جاسکتا یہ درحقیقت شبہہ عقل ہے اور اس کا اصل نام شیطنت ہے۔

امیر المومنینؑ کے متعدد خطوط اور خطبات سے پوری طرح واضح ہے کہ آپ امیر شام معاویہ کے تمام سیاسی چکر مکر، اور حیلہ وفریب سے پوری طرح واقف تھے لیکن کبھی بھی آپ ان شعبدے بازیوں کے

مقابلے کے لئے اپنے بلند معیار سے نیچے اترنے اور حدود الٰہی کو پامال کرنے پر راضی نہیں ہوئے۔

یہاں ایک اور اہم بات قابل ذکر ہے کہ باوجود اس کے کہ آپ دنیا کو آخرت کے مقابلے میں بہت پست اور بے اہمیت تصور کرتے تھے، پھر بھی آپ نے کبھی امور حکومت میں کس طرح کی ڈھلائی یا بے توجہی سے کام نہیں لیا اور کبھی بھی اپنی عبادتوں کو حکومت کے کام کاج میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ آپ کے لئے اسلامی معاشرے کا امن و امان اور نظم و نسق اس قدر اہم اور ضروری تھا کہ اس کے لئے آپ نے حرم پیغمبرؐ یعنی مدینہ منورہ کو چھوڑ کر کوفہ کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا تاکہ وہاں سے امیر شام کی ریشہ دوانیوں کا بہتر طریقے سے مقابلہ کریں۔ اگر اس ذمہ داری کے علاوہ ساری دنیا کی دولت بھی علیؑ کو دے دی جاتی پھر بھی شاید آپ قبر پیغمبرؐ کو چھوڑنے پر ہرگز راضی نہ ہوتے۔ آپ کے نزدیک دنیا اور حکومت کی اپنی کوئی ذاتی ارزش اور قیمت نہیں ہے مگر زمین پر عدل اور حق کا قیام چونکہ ایک الٰہی فریضہ ہے لہٰذا یہ فریضہ خود اس امر حکومت کو اہم اور عظیم بنادیتا ہے۔ آپ نے اس حقیقت کو ایک مقام پر اظہار فرمایا ہے:

''عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ میں مقام ذی قار میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ اپنا جوتا ٹانک رہے ہیں (مجھے دیکھ کر فرمایا اے ابن عباس اس جوتے کی کیا قیمت ہوگی؟) میں نے کہا کہ اب تو اس کی کچھ بھی قیمت نہ ہوگی، تو آپ نے فرمایا کہ اگر میرے پیش نظر حق کا قیام اور باطل کا مٹانا نہ ہوتو تم لوگوں پر حکومت کرنے سے یہ جوتا مجھے کہیں زیادہ عزیز ہے''۔ (خطبہ نمبر ۳۳)

حکومت کس کا حق ہے؟

صدر اسلام ہی سے یہ مسئلہ بہت اہمیت کا حامل رہا ہے کہ اسلامی حکومت و سیاست میں حاکمیت کا حق کس کو دیا گیا ہے؟ اور یہ حاکمیت کس طرح قائم و ثابت ہوتی ہے؟ چونکہ اسلام ایک ایسا نظریہ اور مکتب فکر ہے جس کے ہر عقیدے اور عمل کی بنیاد توحید پر رکھی گئی ہے اس لئے اسلام میں حاکم مطلق صرف اور صرف ذات باری تعالٰی ہے۔ قرآن کریم کی متعدد آیتوں سے اس نظریے کی تائید ہوتی ہے چونکہ وہی اس کائنات اور اس کے ذرے ذرے کا خالق و مالک ہے لہٰذا اس کائنات کی حاکمیت مطلقہ بھی صرف اسی کو زیبا ہے مگر چونکہ اس نے انسان کو زمین کا وارث اور زمین پر اپنا خلیفہ قرار دیا ہے اس لئے اس نے انبیاء، اولیاء اور اپنے برگزیدہ بندوں کو اپنی طرف سے حاکمیت کا حق عطا کیا ہے اور ان کی اطاعت اور پیروی عوام پر واجب قرار دی ہے:

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ "اللہ کی اطاعت کرو اس کے رسول کی اطاعت کرو اور صاحبانِ امر کی"۔

خداوند عالم کے بعد لوگوں پر حکومت کرنے کا سب سے زیادہ حق انبیاء کرام کا ہے جنھیں خود قادر مطلق نے اپنے بندوں کے درمیان حق وعدل کے قیام کا ذمہ دار بنایا ہے۔

حکومت کے متعلق مکتب امامیہ کا نظریہ

اس سے پہلے کہ ہم حاکیت کے سلسلے میں امیرالمومنینؑ کے افکار کو زیر بحث لائیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختصار کے ساتھ مکتب امامیہ کے عقیدۂ حاکیت کو پیش کردیں۔ فرقۂ امامیہ کے مطابق رسولؐ نے اپنے وصال سے پہلے ہی حضرت علی علیہ السلام کو واضح طور پر اپنا خلیفہ اور جانشین قرار دیا تھا جب کہ نظریۂ اہل سنت کے مطابق نبیؐ نے اپنے پیچھے کوئی جانشین نہ چھوڑ کر یہ فیصلہ جمہور مسلمین کے حوالے کردیا تھا کہ تم جیسے چاہنا میرے بعد میرا خلیفہ چن لینا۔ اولاً تو یہ بات کسی عام مصلح کے لئے بھی نہیں سوچی جاسکتی کہ وہ جانشینی کا مسئلہ قوم کے اوپر چھوڑ دے جب کہ وہ قوم ابھی ابھی جاہلیت کے اندھیروں سے نکلی ہو چہ جائیکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسی ذمہ دار شخصیت جس نے اکیلے دم پر ایک پست ترین قوم کو جہالت کے ولدل سے کھینچا ہو وہ کیونکر اتنے اہم اور نازک مسئلہ کو مسلمانوں کے درمیان نزاع کے لئے چھوڑ جائے گا۔ دوئم یہ کہ قرآن میں ہمیں انبیاء کی سنت بھی یہی نظر آتی ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے جانشین کا اعلان کردیا۔ جیسے موسیٰ کے جانشین ہارون، یعقوب کے جانشین یوسف، داؤد کے جانشین سلیمان وغیرہ اور سوم یہ کہ جمہور مسلمین کے درمیان اپنا حق ثابت کرنے کے لئے خلیفۂ اول نے جو دلیل دی یعنی رسولؐ سے قرابت کی دلیل، وہی دلیل خود حضرت علیؑ کے حق وصایت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے اس لئے کہ اگر حضرت ابوبکر رسولؐ کے قبیلے اور گروہ مہاجرین میں ہونے کی وجہ سے خلافت کے سزاوار تھے تو حضرت علیؑ ان دونوں اعتبار سے بدرجۂ اولیٰ خلافت کے حقدار تھے۔ اس بات کو ایک مقام پر نہج البلاغہ میں بھی نقل کیا گیا ہے:

"پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد جب سقیفہ بنی ساعدہ کی خبریں امیرالمومنین تک پہنچیں تو...... حضرت نے پوچھا قریش نے کیا کیا؟ لوگوں نے کہا کہ انھوں نے شجرۂ رسولؐ سے ہونے کی وجہ سے اپنے استحقاق پر استدلال کیا۔ تو حضرتؑ نے فرمایا کہ انھوں نے شجرہ ایک ہونے سے تو استدلال کیا، لیکن اس کے

پھلوں کو ضائع و برباد کر دیا''۔ (خطبہ ۶۵)

عقیدۂ امامیہ کے مطابق نہ صرف حضرت علیؑ بلکہ ان کی ذریت میں گیارہ اور ہدایت یافتہ امام نصِ پیغمبرؐ کے مطابق پیغمبرؐ کی خلافت کے حقدار ہیں جس سلسلے کے آخری امام، امام مہدی پردۂ غیب میں ہیں اور جب وہ ظاہر ہوں گے تو ایک آفاقی اسلامی حکومت زمین پر قائم ہوگی اور زمین کا کوئی خطہ اس حکومت کے قلمرو سے باہر نہ ہوگا اور وہ حضرت بحکم خدا اس حکومت کی سر براہی فرمائیں گے۔ رہ گیا ان نصوص اور روایات کا بیان جو ان حضرات کے سلسلے میں پیغمبرؐ سے وارد ہوئی ہیں تو وہ تعداد میں اتنی زیادہ ہیں جن کا مکمل تذکرہ ایک مقالے میں تو کیا ایک مفصل کتاب میں بھی نہیں ہوسکتا۔ پھر بھی عذیرِ خم پر نبیؐ نے علیؑ کے لئے جو اعلان فرمایا "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ"

''یعنی جس کا میں مولا ہوں یہ علی بھی اس کے مولا ہیں''۔ تقریباً حدیث کی سبھی کتابوں میں اس کا بیان ملتا ہے، اسی طرح نبیؐ کی حدیث:

''میرے بعد میرے بارہ جانشین ہوں گے اور وہ سب کے سب قریش سے ہونگے''۔ یہ روایت بھی بشمول صحیح بخاری و صحیح مسلم، اہل سنت اور اہل تشیع کی تمام کتب احادیث میں پائی جاتی ہے۔ امیرالمومنینؑ نے خود نہج البلاغہ میں کئی مقامات پر اس نظریے کا اظہار کیا ہے۔

''اس امت میں کسی کو آلِ محمدؐ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا جن لوگوں پر انکے احسانات ہمیشہ جاری رہے ہوں وہ ان کے برابر نہیں ہوسکتے۔ وہ دین کی بنیاد اور یقین کے ستون ہیں۔ آگے بڑھ جانے والے کو ان کی طرف پلٹ کر آنا ہے اور پیچھے رہ جانے والے کو ان سے آ کر ملنا ہے۔ حقِ ولایت کی خصوصیات انہی کے لئے ہیں اور انہی کے بارے میں پیغمبر کی وصیت اور انہی کیلئے نبیؐ کی وراثت ہے۔ اب یہ وقت وہ ہے کہ حق اپنے اہل کی طرف پلٹ آیا اور اپنی صحیح جگہ پر منتقل ہوگیا''۔ (خطبہ نمبر ۲)

اس خطبے میں امیرالمومنینؑ نے صاف الفاظ میں ظاہر کر دیا ہے کہ صرف آلِ محمد یعنی آئمہ معصومین ہی پیغمبر کی وصایت اور وراثت کے اصل حقدار ہیں اور یہ ولایت اور رہبری کا درجہ چند خصوصیات کا حامل ہے جو انھیں حضرات میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی مقامات پر امیرالمومنین نے خلافت کو اپنا حق کہا ہے:

''مجھ سے ایک کہنے والے نے کہا کہ اے ابن ابی طالب آپ تو اس خلافت پر للچائے ہوئے ہیں۔ تو میں نے کہا کہ خدا کی قسم تم اس پر کہیں زیادہ حریص اور (اہلیت کے لحاظ سے) دور ہو۔ اور

میں اس کا اہل اور پیغمبرؐ سے نزدیک تر ہوں۔ میں نے تو اپنا حق طلب کیا ہے اور تم میرے اور میرے حق کے درمیان حائل ہو جاتے ہو"۔ (خطبہ نمبر ۱۷۰) اس خطبے میں امام آگے فرماتے ہیں:

"خدایا! میں قریش اور ان کے مددگاروں کے خلاف تجھ سے مدد چاہتا ہوں کیونکہ انھوں نے قطع رحمی کی اور میرے مرتبے کی بلندی کو پست سمجھا اور اس (خلافت) پر جو کہ میرے لئے مخصوص تھی ٹکرانے کے لئے ایکا کرلیا ہے۔ پھر کہتے یہ ہیں کہ حق تو یہی ہے کہ آپ اسے لیں اور یہ بھی حق ہے کہ آپ اس سے دستبردار ہو جائیں"۔

نہج البلاغہ کے ان اقتباسات کو دیکھنے کے بعد اس بات میں کسی طرح کے شک یا ابہام کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ امیرالمومنینؑ خلافت رسولؐ کو اپنا مخصوص حق سمجھتے تھے اور یہ بھی کہ نبیؐ نے صرف ان ہی کی خلافت کے لئے وصیت فرمائی تھی۔

مگر ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالا جاسکتا کہ کسی اور کو حکومت کرنے کا یا مسلمانوں کے امور کو سنبھالنے کا حق ہی نہیں ہے۔ ان باتوں سے صرف یہ نتیجہ قطعی طور پر نکالا جاسکتا ہے کہ جنھیں خود پیغمبر اکرمؐ نے منصوص و معین کیا ہو اس کے سامنے اجتہاد، شوریٰ، بیعت یا دوسرے کسی بھی طریقے کی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ ہاں اگر پیغمبرؐ یا اس کے وصی کی جانب سے کوئی صراحت نہ ہو اور اس کے بعد عوام الناس یا معاشرے کے ارباب حل و عقد امت مسلمہ میں سے کسی کو اپنا حاکم منتخب کر لیتے ہیں تو اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ ایسی حکومت کی حیثیت قانونی اور شرعی ہوگی۔

حکومت کے سلسلے میں ہمارا یہ عقیدہ ہرگز نہیں ہے کہ آئمہ معصومین کے سوا کوئی حاکم ہو ہی نہیں سکتا، ہاں ہمارا یہ عقیدہ ضرور ہے کہ ان کے موجود رہتے ہوئے کسی اور کو حکومت کرنے کا حق نہیں ہے۔ غیبت امامؑ کے دوران مسلمانوں کے امور ظہور کے انتظار تک معطل نہیں رہ سکتے اور ان کے انتظام کے لئے کسی حاکم اور ناظم کا ہونا بہرحال ضروری ہے۔

حاکم کی صفات

اسلامی معاشرے کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہونا یقینی طور پر ایک عظیم ذمہ داری ہے جسے ہر راہ چلتا انسان نہیں نبھا سکتا۔ امیرالمومنینؑ نے بھی نہج البلاغہ میں جگہ جگہ اس امر کو ایک بڑی ذمہ داری اور بارگراں سے تعبیر کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان صفات کا بھی ذکر کیا ہے جن کا ایک حاکم میں پایا جانا لازمی اور ضروری ہے یہاں پر ہم اسی سلسلے میں نہج البلاغہ سے چند اقتباسات نقل کریں گے:

''یاد رکھو کہ اللہ کے نزدیک سب بندوں سے بہتر وہ انصاف پرور حاکم ہے جو خود بھی ہدایت پائے اور دوسروں کو بھی ہدایت کرے اور جانی پہچانی ہوئی سنت کو مستحکم کرے اور انجانی بدعتوں کو فنا کرے۔ سنتوں کے نشانات جگمگا رہے ہیں اور بدعتوں کی علامتیں بھی واضح ہیں اللہ کے نزدیک سب لوگوں سے بدتر وہ ظالم حکمراں ہے جو گمراہی میں پڑا رہے اور دوسرے بھی اس کی وجہ سے گمراہی میں پڑے رہیں اور (رسول سے) حاصل کی ہوئی سنتوں کو تباہ اور قابل ترک بدعتوں کو زندہ کرے۔ (خطبہ ۱۶۴)

''اے لوگو! تم لوگوں میں اس خلافت کا اہل وہ ہے جو اس کے (نظم ونسق کے برقرار رکھنے) کی سب سے زیادہ قوت وصلاحیت رکھتا ہو اور اس کے بارے میں اللہ کے احکام کو سب سے زیادہ اہم جانتا ہو۔ اس صورت میں اگر کوئی فتنہ پرداز فتنہ کھڑا کرے تو پہلے تو اس سے توبہ و بازگشت کے لئے کہا جائے گا اور اگر وہ انکار کرے تو اس سے جنگ و جدال کی جائے گی'' (خطبہ ۱۷۱)

ان دو اقتباسات سے حاکم کے سلسلے میں امیرالمومنینؑ کا نقطۂ نظر پوری طرح ظاہر ہوجاتا ہے۔ آپ کے نزدیک ایک حاکم اور فرمانروا کے لئے دو سب سے بڑی صفات عدل اور احکام الٰہیہ کا علم ہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ خود بھی ہدایت یافتہ ہو اور عوام کو بھی ہدایت کی راہ پر لگائے۔ امیرالمومنینؑ کے اس نظریئے کی تائید قرآن مجید کی بہت سی آیات سے بھی ہوتی ہے مثال کے طور پر "قَالَ لَایَنَالُ عَهْدِ الظّٰلِمِیْنَ" میرا عہدہ ظالمین کو ہرگز نہیں ملے گا یا "اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفَاهُ عَلَیْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ" بے شک اللہ نے اس (طالوت) کو تم پر فضیلت دی ہے اور (حاکم) منتخب کیا ہے اور اس کو علم اور جسمانی قوت زیادہ عطا کی ہے''۔ (بقرۃ / ۲۴۷)

جہاں ایک طرف آپؑ نے حاکم کے صفات پر روشنی ڈالی ہے وہیں چند مقامات پر کچھ لوگوں کو سرے سے خلافت اور حکومت کے لئے نااہل بھی قرار دیا ہے:

''اے معاویہ! بھلا تم لوگ کب رعیت پر حکمرانی کی صلاحیت رکھتے تھے، اور کب امت کے امور کے والی و سرپرست تھے؟ بغیر کسی پیش قدمی اور بغیر کسی بلند عزت ومنزلت کے ہم دیرینہ بدبختیوں کے گھر کو لینے سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ میں اس چیز پر تمہیں متنبہ کئے دیتا ہوں کہ تم ہمیشہ آرزوؤں کے فریب پر فریب کھاتے ہو اور تمہارا ظاہر باطن سے جدا رہتا ہے''۔ (مکتوب ۱۰)

ان سطروں سے صاف ہے کہ بغیر شخصی فضائل و کمال اور جذبۂ خدمتِ اسلام کے کوئی انسان خلافت و امارت کا حقدار نہیں بن سکتا۔ جس کا ظاہر و باطن الگ اور جو آرزوؤں کے دام فریب میں

گرفتار ہو وہ کس طرح مسلمانوں کے امور کا ذمہ دار بنایا جاسکتا ہے؟۔ امیرالمومنینؑ نے اپنے عمال کو بھی یہی تاکید کی کہ جب بھی کسی کو عہدہ دیں تو پوری طرح جانچ پڑتال کریں تا کہ کوئی نااہل کسی بڑے یا ذمہ دار منصب تک نہ پہنچ جائے چنانچہ ایک مقام پر آپ حضرت مالک اشتر کو تحریر فرماتے ہیں:

''پھر اپنے عہدے داروں کے بارے میں نظر رکھنا ان کو خوب آزمائش کے بعد منصب دینا کبھی بھی صرف رعایت اور جانبداری کی بنا پر انھیں منصب عطا نہ کرنا۔ اس لئے کہ یہ باتیں ناانصافی اور بے ایمانی کا سرچشمہ ہیں اور ایسے لوگوں کو منتخب کرنا جو آزمودہ و غیرت مند ہوں۔ ایسے خاندانوں میں سے جو اچھے ہوں۔ اور جن کی خدمات اسلام کے سلسلے میں پہلے سے ہوں کیونکہ ایسے لوگ بلند اخلاق اور بے داغ عزت والے ہوتے ہیں۔ حرص و طمع کی طرف کم جھکتے ہیں اور عواقب و نتائج پر زیادہ نظر رکھتے ہیں''۔ (مکتوب ۵۳)

علم و عدل ہی اسلام کے سیاسی نظام کی اصل

امیرالمومنینؑ کے افکار، پیغمبر اسلامؐ کی احادیث اور قرآن کے نظریات کی معمولی واقفیت رکھنے والا انسان بھی بڑی آسانی سے یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام کی تعمیر جن دو بنیادوں پر کی گئی ہے وہ علم اور عدل ہیں جن کے بغیر کسی بھی انسان کو امت کی امارت اور حکومت کا حق حاصل نہیں ہوسکتا۔ قرآن مجید کی ایک ہی آیت اس نظریہ کی تائید کے لئے کافی ہے وہ سورۂ حدید کی چوبیسویں آیت ہے:

''بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تا کہ لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں''۔

اس آیۂ مبارکہ میں اللہ نے اپنے رسولوں کو دنیا میں بھیجنے کی غرض و غایت یہ بیان کی ہے کہ لوگوں میں عدل و انصاف قائم ہوجائے اور اس عدل و انصاف کے قیام ہی کے لئے انبیاء کرام کو علم کتاب عطا کیا گیا۔ رہ گئی بات روشن دلیلوں کی تو مفسرین کا ایک زبان یہی کہنا ہے کہ ''بینات'' سے مراد انبیاء کے معجزات ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک عام حاکم کے لئے معجزات پیش کرنا ناممکن ہے مگر اس کے بعد کے جو شرائط ہیں وہ ہر حاکم کے دائرہ امکان ہی میں نہیں، بلکہ عہدۂ امارت کے لئے واجب و لازم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہی بات پیغمبر اسلامؐ کی ایک مشہور حدیث سے ظاہر ہوتی ہے کہ: "الملکُ یبقیٰ مع الکفر ولا یبقیٰ مع الظلم" یعنی حکومت کفر کے ساتھ تو باقی رہ سکتی ہے مگر ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہ سکتی''۔

یعنی حکومت و امارت کیلئے ظلم کرنا سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں دو رائے نہیں کہ کفر بھی ایک طرح کا ظلم ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ سب سے بڑا ظلم ہے مگر چونکہ یہ ظلم بندوں پر نہیں بلکہ ذات خدا پر ہے اور اللہ اپنے دشمنوں کو اکثر طویل مہلت دے دیتا ہے اور اسی دنیا میں ان پر رزق اور عرصۂ حیات تنگ نہیں کرتا اس لئے ایک بے دین اور کافر حکومت تو دنیا میں باقی رہ سکتی ہے مگر بندوں پر ظلم کرنے والی حکومت کے لئے ایک دن کی بھی گارنٹی نہیں لی جاسکتی۔

حاکم کی ذمہ داریاں

امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں حاکم کی ذمہ داریوں کے سلسلے سے اتنا کچھ ارشاد فرمایا ہے جن کی نقل و شرح کرنے کے لئے ضخیم کتابیں درکار ہیں۔ ایک چھوٹے سے مقالے میں ان تمام کلام کا احاطہ کرنا جو آپ نے حکومتوں کی ذمہ داریوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے یقیناً ناممکن ہے پھر بھی اپنے مضمون کو پورا کرنے کے لئے ہم یہاں چند کلمات اور مثالوں پر ہی اکتفاء کریں گے۔ حاکم کی ذمہ داریوں کے تعلق سے آپ کا وہ مکتوب جسے آپ نے مالک اشتر نخعی کے لئے تحریر فرمایا تھا علم سیاست کے شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے اس دستاویز میں آپ نے حکومت، حاکم اور رعایا سے جڑے ہوئے تمام پہلوؤں پر پوری روشنی ڈالی ہے اور ایک مثالی اسلامی حکومت کا خاکہ کھینچ دیا ہے۔ ہم اس باب میں بنیادی طور پر اسی عہدنامے پر تکیہ کریں گے۔

اس عہدنامے کے شروعاتی کلمات ہی میں آپ نے حاکم وقت کی بنیادی ذمہ داریوں کی جانب واضح اشارہ کردیا ہے آپ فرماتے ہیں: ”یہ ہے وہ فرمان جس پر کاربند رہنے کا حکم دیا ہے خدا کے بندے علی امیر المومنین نے مالک ابن حارث اشتر کو جب مصر کا انھیں والی بنایا تاکہ وہ خراج جمع کریں، دشمنو سے جنگ کریں، رعایا کی فلاح و بہبود اور شہروں کی تعمیر و آبادی کا انتظام کریں“۔ (مکتوب ۵۳)

آپ کے اس پہلے جملے سے ایک حاکم اسلامی کی چار بنیادی ذمہ داریوں کا تعین ہوتا ہے یعنی

(۱) خراج کی جمع آوری (اقتصادی پہلو)

(۲) دشمنوں سے جنگ (دفاعی پہلو)

(۳) رعایا کی فلاح و بہبود (فلاحی اور سماجی پہلو)

(۴) تعمیر و آبادی کا انتظام (انتظامی پہلو)

دیکھا جائے تو پہلے جملے ہی میں امیر المومنین نے حاکموں کی ذمہ داریوں کے حدود اربعہ کا تعین

فرمادیا ہے۔ بنیادی طور پر یہی وہ ذمہ داریاں ہیں جن کے لئے حکومتوں کا قیام عمل میں آتا ہے مگر امیر المومنینؑ نے ان ذمہ داریوں کے علاوہ حاکموں کے لئے چند اخلاقی ذمہ داریاں بھی معین کی ہیں جن کا تذکرہ ہم سب سے پہلے کریں گے۔

اخلاقی ذمہ داریاں

امیر المومنینؑ نے خود اپنے اور اپنے مقرر کردہ عمّال کے لئے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کہ کہیں حاکم ہونے کا خیال دل و دماغ پر چھا نہ جائے اور جس کے نتیجے میں خدمت خلق کا جذبہ مضمحل پڑ جائے، لہٰذا ایک مقام پر آپ مالک اشتر کو تحریر فرماتے ہیں:

''کبھی یہ نہ کہنا کہ میں حاکم بنایا گیا ہوں، لہٰذا میرے حکم کے آگے سر تسلیم خم ہونا چاہئے، کیونکہ یہ دل میں فساد پیدا کرنے، دین کو کمزور بنانے اور بربادیوں کو قریب لانے کا سبب ہے اور کبھی حکومت کی وجہ سے تم میں تمکنت یا غرور پیدا ہو تو اپنے سے بالاتر اپنے خالق کی عظمت کو دیکھو اور خیال کرو کہ وہ تم پر وہ قدرت رکھتا ہے جو خود تم اپنے آپ پر نہیں رکھتے، یہ چیز تمہاری رعونت و سرکشی کو دبا دے گی اور تمہاری طغیانی کو روک دے گی، اور تمہاری کھوئی عقل کو پلٹا دے گی''۔ (عہدنامہ ۵۳)

اسی طرح نہج البلاغہ میں ایک واقعہ ملتا ہے کہ جب عبداللہ ابن زیاد حارثی نے اپنے بھائی عاصم کے رہبانیت کی امیر المومنینؑ سے شکایت کی اور آپ نے عاصم کو رہبانیت کی زندگی ترک کرنے کی تنبیہہ کی تو اس نے کہا:

''یا امیر المومنینؑ آپ کا پہناوا بھی تو موٹا جھوٹا اور کھانا روکھا سوکھا ہوتا ہے تو حضرت نے فرمایا کہ تم پر حیف ہے، میں تمہارے مانند نہیں ہوں، خدا نے ائمہ حق پر فرض کیا ہے کہ وہ اپنے کو مفلس و نادار لوگوں کی سطح پر رکھیں تا کہ مفلوک الحال اپنے فقر کی وجہ سے پیچ و تاب نہ کھائے''۔ (خطبہ ۲۰۵)

امیر المومنینؑ کے مطابق حکمراں طبقے کی یہ اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے معیارِ زندگی کو انتہائی سادہ رکھیں تا کہ رعیت میں سے غریب و نادار طبقہ اپنے حاکم کے معیار زندگی کو دیکھ کر کچھ سکون محسوس کرے مگر امر واقعہ یہی ہے کہ شاید امیر المومنینؑ اپنے بنائے ہوئے راستے کے اکیلے راہی تھے اس لئے کہ ان کے علاوہ ہمیں تاریخ میں ایسا کوئی حکمراں نظر نہیں آتا جو حاکم ہو کر بھی پیوند لگے ہوئے کپڑے اور جو کی سوکھی روٹیاں استعمال کرے۔ دوسروں کا کیا ذکر ہے آج نام نہاد اسلامی کہے جانے والے ممالک کے سربراہان، جاہ جلال، اور شان و شوکت میں دوسرے ممالک کے حکمرانوں سے کہیں

زیادہ آگے نظر آتے ہیں۔ ایسا اس لئے ہوا کیونکہ اسلام جو کہ بنیادی طور پر حق کے قیام اور سماجی انصاف کی ایک پرزور تحریک تھی، اسے شہنشاہیت اور ملوکیت میں تبدیل کردیا گیا اسلام نے ایسے بے تخت و تاج کے حکمراں کا تصور پیش کیا تھا جو کمزور اور مستضعفین کے مونس و مددگار ہوں اور زمانے کے متکبرین سے ان کا حق دلوائیں، اور جن کی زندگی میں اصراف فضول خرچی اور شاہانہ ٹھاٹ باٹ کا شائبہ تک نہ ہو مگر انقلاب زمانہ سے پیغمبر اسلامؐ کی وہی تحریک ملوکیت کے ہاتھوں میں آنے کے بعد کمزوروں اور مظلوموں کے گلے کا طوق بن گئی۔ بنی امیہ، بنی عباس، اور آج کے حکمراں سب اس راستے پر گامزن ہیں اور تاریخ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اسلامی تحریک کو جتنا نقصان شہنشاہیت اور ملوکیت سے پہنچا اتنا یہودیت، مسیحیت یا کفروالحاد سے ہرگز نہیں پہنچا۔

اقتصادی ذمہ داریاں

اسلامی شریعت کی رو سے حاکم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ رقم شرعیہ جیسے زکوۃ، خمس مختلف النوع ٹیکس، صدقات وغیرہ جمع کرے اور اسے امت کی فلاح و بہبود کے راستے میں خرچ کرے، نہ تو وہ ٹیکس وصول کرنے میں اتنا سخت اور تند خو ہو کہ رعیت اس کے بوجھ سے بلبلانے لگے اور نہ ہی اس مال کو خرچ کرنے میں اتنا بخیل کہ عوام کو کسی فائدے کی امید ہی باقی نہ رہے۔ مالک اشتر کو لکھے اپنے عہد نامے میں ایک مقام پر امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں:

''مالگزاری کے معاملے میں مالگزاری ادا کرنے والوں کا مفاد پیش نظر رکھنا، کیونکہ باج اور باجگزاروں کی بدولت ہی دوسروں کے حالات درست کئے جاسکتے ہیں۔ سب اسی خراج اور خراج دینے والوں کے سہارے پر چلتے ہیں۔ اور خراج کی جمع آوری سے زیادہ زمین کی آبادی کا خیال رکھنا کیونکہ خراج بھی تو زمین کی آبادی ہی سے حاصل ہوسکتا ہے اور جو تعمیروآبادی کے بغیر خراج چاہتا ہے وہ ملک کی بربادی اور بندگانِ خدا کی تباہی کا سامان کرتا ہے اور اس کی حکومت تھوڑے دنوں سے زیادہ نہیں رہ سکتی۔ اب اگر وہ خراج کی گرانباری یا کسی آفت ناگہانی یا نہری و بارانی علاقوں میں ذرائع آبپاشی کے ختم ہونے یا زمین کے سیلاب میں گھر جانے یا سیرابی کے نہ ہونے کے باعث اس کے تباہ ہونے کی شکایت کریں تو خراج میں اتنی کمی کردو جس سے تمہیں ان کے حالات کے سدھرنے کی توقع ہو، اور ان کے بوجھ کو ہلکا کرنے سے تمہیں گرانی نہ محسوس ہو''۔ (عہدنامہ ۵۳)

ایک دوسرے مقام پر آپ لکھتے ہیں:

''......کیونکہ اگر ملک آباد ہے تو جیسا بوجھ اس پر لادو گے وہ اٹھا لے گا،اور زمین کی تباہی تو اس سے آتی ہے کہ کاشتکاروں کے ہاتھ تنگ ہو جائیں اور ان کی تنگدستی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ حکام مال و دولت سمیٹنے پر تل جاتے ہیں اور انھیں اپنے اقتدار کے ختم ہونے کا کھٹکا لگا رہتا ہے''۔ (عہد نامہ ۵۳)

یہاں امیرالمومنینؑ یہ واضح کردینا چاہتے ہیں کہ حکومتوں کی تباہی کے آثار یہی ہیں حکام مال سمیٹنے میں لگ جائیں اور کاشتکاروں کے ہاتھ تنگ ہوجائیں، اس کی بہترین مثال آج کل ہمارے ملک میں دیکھنے کو مل رہی ہے کہ ایک طرف تو یہ ڈھونڈورا پیٹا جارہا ہے کہ ملک ترقی کی راہوں پر گامزن ہے، دوسری طرف ملک کے کئی حصوں سے کاشتکاروں کی خودکشی کرنے کی خبریں تقریباً روز ہی سنائی دے رہی ہیں۔ کسی بھی ملک میں جب تک کاشتکار اور مزدور بدحال رہے گا، اس ملک کی حکومت کو کامیاب ہرگزنہیں کہا جاسکتا۔ اسی کے ساتھ ساتھ مارکیٹ پر نظر رکھنا اور ضروری اشیاء کی قیمتوں پر کنٹرول رکھنا بھی آپ حاکم کے اہم فرائض میں شمار کرتے تھے چنانچہ ایک مقام پر فرماتے ہیں:

''ہاں اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھو کہ ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو انتہائی تنگ نظر اور بڑے کنجوس ہوتے ہیں جو نفع اندوزی کے لئے مال روک رکھتے ہیں اور اونچے نرخ معین کر لیتے ہیں۔ یہ چیز عوام کے لئے نقصان دہ اور حکام کی بدنامی کا باعث ہوتی ہے، لہٰذا ذخیرہ اندوزی سے منع کرنا، کیونکہ رسول اللہؐ نے اس سے ممانعت فرمائی ہے اور خرید وفروخت صحیح ترازوؤں اور مناسب نرخوں کے ساتھ بسہولت ہونا چاہئے کہ نہ بیچنے والے کو نقصان ہو اور نہ خریدنے والے کو خسارہ ہو اس کے بعد بھی کوئی ذخیرہ اندوزی کا مرتکب ہو تو اسے مناسب حد تک سزا دینا''۔ (عہد نامہ ۵۳)

اسی طرح آپ نے رعایا کے اس طبقے کا بھی خاص خیال رکھنے کی تاکید کی ہے جسے تاجر اور اہل صنعت کہا جاتا ہے۔ سماج کا یہی طبقہ اس کی اقتصادی صحت کی ضمانت ہوتا ہے اور اسی طبقے سے حاصل ہونے والے ٹیکس کے ذریعہ ہی کاروبارِ حکومت چلتا ہے اسی لئے امیرالمومنینؑ نے ایک مقام پر اس طبقے کے بارے میں اس طرح ارشاد فرمایا ہے:

''پھر تمہیں تاجروں اور صناعوں کے خیال اور ان کے ساتھ اچھے برتاؤ کی ہدایت کی جاتی ہے اور تمہیں دوسروں کو ان کے متعلق ہدایت کرنا ہے خواہ وہ ایک جگہ رہ کر بیوپار کرنے والے ہوں یا پھیری لگاکر بیچنے والے ہوں یا جسمانی مشقت (مزدوری یا دستکاری) سے کمانے والے ہوں کیونکہ یہی لوگ منافع کا سرچشمہ اور ضروریات کے مہیا کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں''۔ (عہد نامہ ۵۳)

دفاعی ذمہ داریاں

حاکم کی اہم ترین ذمہ داریوں میں سے سے ایک دفاعی ذمہ داری بھی ہے۔ اگر کسی قوم یا ملک کی دفاعی قوت مضبوط ہے تو اس کی جانب کوئی نگاہ ڈالنے کی ہمت نہیں کرتا، فوج کی مضبوطی سے رعایا کے دل ٹھہرے رہتے ہیں اور انھیں کسی بات کا کھٹکا نہیں رہتا۔ امیرالمومنینؑ کے نزدیک بھی دفاعی ذمہ داری حاکم کی اہم ذمہ داریوں میں سے ایک ہے نہج البلاغہ میں متعدد مقامات پر آپ نے فوج، اس کی اہمیت اور اس کے نظم ونسق پر گراں بہا کلمات ارشاد فرمائے ہیں اور اپنے عمال سے تاکید کی ہے کہ اپنی دفاعی قوت کو مضبوط رکھیں ایک مقام پر مالک اشتر سے ارشاد فرماتے ہیں:

''فوجی دستے بحکم خدا رعیت کی حفاظت کا قلعہ، فرمانرواؤں کی زینت، دین و مذہب کی قوت اور امن کی راہ ہیں۔ رعیت کا نظم ونسق انہی سے قائم رہ سکتا ہے اور فوج کی زندگی کا سہارا وہ خراج ہے جو اللہ نے اس کے لئے معین کیا ہے''۔ (عہد نامہ ۵۳)

امیرالمومنین کے مطابق ایک مضبوط فوج ملک کے امن کی ضمانت ہے کیونکہ فوجی لحاظ سے کمزور ملک کبھی بھی دشمن کے لئے ایک تر نوالہ ثابت ہوسکتا ہے، آپ نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کے لئے خاص کر وصیتیں فرمائیں ہیں اس لئے کہ قرآن نے بھی مجاہدین اسلام کا درجہ اپنے گھر میں بیٹھ جانے والوں سے بلند رکھا ہے۔ امیرالمومنینؑ چونکہ خود اسلام کے سب سے بڑے سپاہی اور علمبردار لشکر تھے لہٰذا آپ سے بہتر فوج اور فوجیوں کے نفسیات کون سمجھ سکتا ہے ایک مقام پر مجاہدین کے لئے ارشاد فرماتے ہیں:

''اور فوجی سرداروں میں تمہارے یہاں وہ بلند منزلت سمجھا جائے جو فوجیوں کی اعانت میں برابر کا حصہ لیتا ہو۔ اور اپنے روپے پیسے سے اتنا سلوک کرتا ہو جس سے انکا اور ان کے پیچھے رہ جانے والے بال بچوں کا بخوبی گزارا ہوسکتا ہو تاکہ وہ ساری فکروں سے بے فکر ہوکر پوری یکسوئی کے ساتھ دشمن سے جہاد کریں۔ اس لئے کہ فوجی سرداروں کے ساتھ تمہارا مہربانی سے پیش آنا ان کے دلوں کو تمہاری طرف موڑے گا''۔ (عہد نامہ ۵۳)

انتظامی اور فلاحی ذمہ داری

ایک حاکم کے لئے سب سے بڑی ذمہ داری یہی ہے کہ اس کے دور حکومت میں رعایا مطمئن اور آسودہ ہو، اگر چہ تاریخ میں ہم نے یہی دیکھا کہ حکمراں تو اپنے عشرت کدوں میں دادِ عیش لیتے رہے

اور عوام خون کے آنسو روتے رہے۔ تاریخ میں شاید ہی کوئی حکمراں ایسا گزرا ہو جو اپنے عوام کے فقر وفاقہ کو مٹانے کے لئے دن کے علاوہ راتوں کو بھی ہمہ تن منہمک رہے۔ امیرالمومنینؑ کی حکومت تاریخ کی ایک ایسی ہی حکومت تھی جس میں آپ رات کے وقت روٹیوں کی گٹھری لے کر فقراء اور مساکین کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے تھے۔ آپ نے اپنے دورِ حکومت میں سماج کے نچلے طبقے پر خاص توجہ دی اس لئے کہ یہی وہ طبقہ ہے جس کا ہر دور میں استحصال ہوتا رہا ہے۔ اس لئے کہ بلند اور متوسط طبقہ کسی نہ کسی طرح اپنا کام بہرحال نکال ہی لیتا ہے۔ آپ نے اپنے عمال کو جو ہدایات جاری کی ہیں ان میں ایک طرف تو بطور کلی رعایا کا خیال رکھنے کو کہا گیا ہے اور دوسری طرف سماج کے کمزور طبقوں پر خصوصی توجہ دینے کا حکم بھی دیا گیا ہے مثال کے طور پر:

''حکمرانوں کے لئے سب سے بڑی آنکھوں کی ٹھنڈک اس میں ہے کہ شہروں میں عدل و انصاف برقرار رہے اور رعایا کی محبت ظاہر ہوتی رہے اور ان کی محبت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جبکہ ان کے دلوں میں میل نہ ہو اور ان کی خیرخواہی اسی صورت میں ثابت ہوتی ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں کے گرد حفاظت کے لئے گھیرا ڈالے رہیں۔ ان کا اقتدار سر پر بوجھ نہ سمجھیں اور نہ ان کی حکومت کے خاتمہ کے لئے گھڑیاں گنیں''۔

''پھر خصوصیت کے ساتھ اللہ کا خوف کرنا پسماندہ اور افتادہ طبقہ کے بارے میں جن کا کوئی سہارا نہیں ہوتا۔ وہ مسکینوں، محتاجوں، فقیروں اور معذوروں کا طبقہ ہے ان میں تو کچھ لوگ ہاتھ پھیلا کر مانگنے والے ہوتے ہیں اور کچھ کی صورت سوال ہوتی ہے اللہ کی خاطر ان بے کسوں کے بارے میں اس کے اس حق کی حفاظت کرنا جس کا اس نے تمہیں ذمہ دار بنایا ہے ان کے لئے ایک حصہ بیت المال سے معین کر دینا اور ایک حصہ ہر شہر کے اس غلہ میں سے دینا جو اسلامی غنیمت کی زمینوں سے حاصل ہوا ہو...... لہٰذا اپنی توجہ ان سے نہ ہٹانا اور نہ تکبر کے ساتھ ان کی طرف سے اپنا رخ پھیرنا اور خصوصیت کے ساتھ خبر رکھو ایسے لوگوں کی جو تم تک پہنچ نہیں سکتے جنھیں آنکھیں دیکھنے سے کراہت کرتی ہوں گی اور لوگ انھیں حقارت سے ٹھکراتے ہوں گے، تم ان کے لئے اپنے کسی بھروسے کے آدمی کو جو خوف خدا رکھنے والا اور متواضع ہو مقرر کر دینا کہ وہ ان کے حالات تم تک پہنچاتا رہے''۔ (عہدنامہ ۵۳)

''اور تم اپنے اوقات کا ایک حصہ حاجتمندوں کے لئے معین کر دینا جس میں سب کام چھوڑ کر ان ہی کے لئے مخصوص ہو جانا اور ان کے لئے ایک عام دربار کرنا اور اس میں اپنے پیدا کرنے والے اللہ

کے لئے تواضع و انکساری سے کام لینا اور فوجیوں، نگہبانوں اور پولیس والوں کو ہٹا دینا تا کہ کہنے والے بے دھڑک کہہ سکیں"۔ (عہد نامہ ۵۳)

کلام امیر المومنینؑ میں سے ان چند اقتباسات پر نظر کرنے سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ رعیت اور عوام ہی علیؑ کی حکومت کا محور تھے آپ نے اپنی حکومت کا بیشتر وقت غریب اور نادار طبقے کی نگہداشت اور دیکھ بھال میں صرف کیا یہاں تک کہ ایک مرتبہ مسجد کوفہ سے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ لوگو! کیا تم میں سے کوئی ایسا بھی ہے جس کا معیار زندگی مجھ سے بھی زیادہ پست ہو، جو مجھ سے بھی زیادہ معمولی غذا اور معمولی پیراہن کا استعمال کرتا ہو؟ امیر المومنین کے اس دعوے کے جواب میں مسجد کوفہ میں ایک سناٹا چھایا ہوا تھا جو اس بات کی دلیل تھا کہ علیؑ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہے۔

روحانی اور مذہبی ذمہ داریاں

امت مسلمہ کے حاکم کی روحانی اور مذہبی ذمہ داریوں کو آخر میں درج کرنے سے یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ ان کی اہمیت کم ہے بلکہ ان کا تذکرہ آخر میں اس لئے کیا جارہا ہے کہ ساری ذمہ داریوں کو سمیٹ کر ایک جگہ درج کیا جاسکے کیونکہ اسلام میں حاکم کی ہر ذمہ داری درحقیقت روحانی اور مذہبی ہے اور اس کے کسی عمل کو دین سے ہٹ کر نہیں دیکھا جاسکتا۔ ابتدائی طور پر اسلام نے ایسی ہی حکومت کا تصور پیش کیا تھا جس کا سربراہ روحانی پیشوا بھی ہو اور حاکم وقت بھی، پیغمبرؐ کی آنکھ بند ہونے کے بعد کچھ لوگوں نے امیر المومنین کے حق کو پامال کر کے حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لی تب بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور خلیفہ کو مذہبی رہنما اور حاکم وقت دونوں حیثیتیں حاصل تھیں، یہاں تک کہ خلافت حضرت علیؑ علیہ السلام تک پہنچی تو آپ کی حیثیت بھی مسلمانوں کے نزدیک خلیفۂ رسولؐ اور حاکم وقت کی تھی۔ حاکم وقت کے فرائض میں یہ شامل تھا کہ وہ تمام دینی معاملات میں اس کی قیادت کرے۔ یہ تو بعد میں مسلمان بادشاہوں کی سیاہ کاری اور عیش پرستی کا نتیجہ تھا کہ حکومت اور دین کو الگ کرنا پڑا ورنہ امت بھی اپنے حاکم کے تمام برے اور قبیح اعمال کو حجت مان کر تسلیم کر لیتی اور یہ کارنامہ فرزند امیر المومنینؑ نواسۂ رسولؐ امام حسینؑ علیہ السلام نے انجام دیا۔ جب آپ نے دیکھا کہ یزید خلیفۂ رسول کی حیثیت سے مسند خلافت پر بیٹھ کر اسلام، رسول اسلام اور شریعت کا مذاق بنا رہا ہے تو آپ نے کربلا کے میدان میں اپنی شہادت پیش کر کے ملوکیت کے چہرے کو بے نقاب کر دیا اور اپنے خون سے قیامت تک کے لئے ایسی لکیر کھینچ دی جس سے بادشاہت اور روحانی سربراہی ہمیشہ

کے لئے الگ ہوگئی۔ کربلا کے واقعہ کے بعد کسی حاکم کے عمل کو امت نے اپنے لئے حجت نہیں سمجھا۔

امیرالمومنینؑ نے اپنے دور خلافت میں اپنے اور اپنے عمال کے لئے مذہبی ذمہ داریوں کو اولین قرار دیا اور ان کا تذکرہ ہمیشہ سب سے پہلے کیا، چنانچہ مالک اشتر کو لکھے اپنے مکتوب میں سب سے پہلے آپ فرماتے ہیں:

''انہیں (مالک اشترکو) حکم ہے کہ اللہ کا خوف کریں، اس کی اطاعت کو مقدم سمجھیں اور جن فرائض وسنن کا اس نے اپنی کتاب میں حکم دیا ہے، ان کا اتباع کریں کہ ان ہی کی پیروی سے سعادت اور ان ہی کے ٹھکرانے اور برباد کرنے سے بدبختی دامنگیر ہوتی ہے اور یہ کہ اپنے دل اپنے ہاتھ اور اپنی زبان سے اللہ کی نصرت میں لگے رہیں...... اس کے علاوہ انھیں حکم ہے کہ وہ نفسانی خواہشوں کے وقت اپنے نفس کو کچلیں اور اس کی منہ زوریوں کے وقت اسے روکیں، کیونکہ نفس برائیوں ہی کی طرف لے جانے والا ہے۔مگر یہ کہ خدا کا لطف وکرم شامل حال ہو''۔ (عہدنامہ ۵۳)

امیرالمومنین کے نزدیک اسلامی حکومت کا ایک بڑا فریضہ یہ ہے کہ امت کی تربیت اس انداز سے کی جائے کہ ان کے اندر تقویٰ و پرہیزگاری اور خوف الٰہی پیدا ہو، اپنے بارے میں خود امیرالمومنینؑ ایک مقام پر ارشادفرماتے ہیں:

''اے لوگو! خدا کی قسم میں اس وقت تک تمہیں کس نیک عمل کی تشویق و ترغیب نہیں دلاتا جب تک میں پہلے اس پر عمل نہ کرلوں اور کسی گناہ سے نہیں روکتا مگر یہ کہ میں پہلے اس سے خود کو محفوظ رکھوں''۔ (خطبہ ۱۷۵)

مسلمانوں کے لئے افسوس کا مقام یہی ہے کہ اپنے اصل حقدار اور وارث سے ہٹ کر جب یہی خلافت غیروں کو ملی تو ان روحانی ذمہ داریوں کا جس طرح مذاق اڑایا گیا اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ معاویہ ابن ابوسفیان نے سیاسی وجوہ کی بنا پر جمعہ کی نماز بدھ کو پڑھائی، ولید نے کوفہ کی مسجد میں مصلّے پر شراب کی قے کی اور صبح کی نماز دو کے بجائے چار رکعت پڑھا کر نمازیوں سے پوچھا کہو تو اور پڑھادوں''۔ یزید نے بھرے دربار میں اسلام اور رسول اسلام کا مذاق اڑایا بلکہ اپنے ایک مصرعے میں کہا کہ'' نہ کوئی خبر آئی نہ کوئی وحی نازل ہوئی یہ تو حکومت کے لئے (معاذ اللہ) ایک کھیل تھا'' اسی طرح تاریخ میں قرآن کریم کو انھیں بادشاہوں کے ذریعہ کبھی نیزوں پر چڑھا دیا گیا، کبھی آگ میں جلایا گیا اور کبھی تیروں کا نشانہ بنایا گیا جس کی پوری تفصیل تاریخ کی کتابوں میں موجود

ہے اور ایک مختصر سے مقالے میں ان سب کے حوالے دینا ممکن نہیں۔ یہاں صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ ملوکیت نے اسلامی سیاست کو اتنا مسخ کیا کہ آج دوسری قوموں کے لئے تمیز کرنا مشکل ہوگیا کہ آیا اسلام کا صحیح طرز حکومت کیا ہے۔ پیغمبرؐ اسلام کی رحلت کو آدھی صدی بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ اسلامی سیاست کا رخ پوری طرح بدل ڈالا گیا۔ حلال حرام میں اور حرام حلال میں تبدیل ہوگیا۔ حضرت محمدؐ اور حضرت علیؑ کے معمولی اور کچے حجروں کی جگہ شام اور بغداد کے سرسبز و شاداب الف لیلوی قصور و محلات نے لے لی۔ قیصروں، خسرووں اور عرب وعجم کے بادشاہوں نے خود کو خلیفہ کہلانا شروع کردیا اور اپنی جابرانہ و ظالمانہ سیرت و سیاست کے ذریعہ ہر میدان میں فرعونوں، قیصروں اور بادشاہوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔

عوام محوری

آج تک جتنی بھی حکومتیں دنیا میں قائم ہوئی ہیں ان میں سے اکثریت کا شعار یہی رہا ہے کہ کسی طرح اہل حکومت اور اس کے گرد جمع ہونے والے ایک خاص حلقے کو آسودگی اور عیش و نوش فراہم کیا جائے۔ جن حکومتوں کا نام تاریخ میں سنہرے الفاظ میں درج کیا جاتا ہے وہاں بھی عوام کی آواز کو سننے اور اس پر لبیک کہنے والا کوئی نظر نہیں آتا، ہندوستان کی مغل حکومت جس کے دور کو ہندوستان کا سنہرا دور کہا جاتا ہے وہاں بھی ایک طرف تاج محل اور بلند دروازہ جیسی عمارتیں تعمیر ہورہی تھیں تو دوسری جانب عوام قحط سالی کی مار سے زندہ درگور ہورہی تھی مگر ظاہر ہے کہ تاریخ کے صفحات ان شہنشاہوں کے ذوق اور فن تعمیر کی تعریفوں سے بھرے ہیں اور ان بے کس و لاچار عوام کے قصے تاریخ کے اندھیروں میں ان کی آہ وفغاں کی طرح گم ہوگئے۔ مگر ہم نے امیرالمومنینؑ کی شکل میں ایک ایسا حکمراں بھی دیکھا جس نے اپنے دور حکومت میں بھر پیٹ غذا صرف اس لئے نہیں کھائی کہ کہیں حجاز و یمن کے دور دراز علاقوں میں کوئی مسلمان بھوکا نہ ہو۔ یہی بات آپ کی حکومت کو دوسروں سے الگ کرتی ہے کہ آپ کی حکومت کا پورا زور صرف اور صرف عوام الناس کی بھلائی پر تھا چاہے اس کے لئے خواص کو ناراض ہی کرنا پڑے، آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ موجودہ دور کی جمہوری (Democratic) حکومتیں جن کی حکومتوں کا دارومدار عوام کے ووٹ پر ہے وہ بھی خواص کو ناراض کرنے کا خطرہ اٹھانے پر تیار نہیں ہیں۔ مالک اشتر کو لکھے اپنے عہد نامے میں امیرالمومنینؑ نے کتنے گراں قدر جملے تحریر فرمائے ہیں:

''تمہیں سب طریقوں سے زیادہ وہ طریقہ پسند ہونا چاہیے جو حق کے اعتبار سے بہترین، انصاف کے لحاظ سے سب کو شامل اور رعایا کے زیادہ سے زیادہ افراد کی مرضی کے مطابق ہو، کیونکہ عوام کی ناراضگی خواص کی رضامندی کو بے اثر بنادیتی ہے اور خواص کی ناراضگی عوام کی رضامندی کے ہوتے ہوئے نظر انداز کی جاسکتی ہے۔ اور یہ یاد رکھو کہ رعیت میں خاص سے زیادہ کوئی ایسا نہیں کہ جو خوش حالی کے وقت حاکم پر بوجھ بننے والا، مصیبت کے وقت امداد سے کترا جانے والا، انصاف پر ناک بھوں چڑھانے والا، طلب وسوال کے موقع پر پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جانے والا، بخشش پر کم شکرگزار ہونے والا اور زمانے کی ابتلاؤں پر بے صبری دکھانے والا ہو اور دین کا مضبوط سہارا، مسلمانوں کی قوت اور دشمنوں کے مقابلے میں سامان دفاع یہی امت کے عوام ہوتے ہیں، لہٰذا تمہاری پوری کی پوری توجہ اور تمہارا پورا رخ ان ہی کی جانب ہونا چاہئے''۔ (عہدنامہ ۵۳)

امیرالمومنینؑ نے اپنے پورے دور خلافت میں اپنے عمّال کو عوام الناس سے براہ راست رابطہ رکھنے کی ہدایت فرمائی تاکہ حکمراں اپنی رعیت کی حقیقی حالت سے پوری طرح واقف رہے ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی رعایا کی حالت کے لئے اپنے وزراء اور افسران کی رپورٹ کا محتاج ہوجائے کیونکہ ایسا حکمراں کبھی بھی رعایا کی صحیح حالت سے واقفیت حاصل نہیں کرسکے گا۔ جب آپ نے قثم ابن عباس کو مکہ کا والی بنایا تو یہ مکتوب روانہ کیا:

''لوگوں کے لئے حج کے قیام کا سروسامان کرو اور اللہ کے یادگار دنوں کی یاد دلاؤ اور لوگوں کے لئے صبح وشام اپنی نشست قرار دو مسئلہ پوچھنے والے کو مسئلہ بتاؤ جاہل کو تعلیم دو اور عالم سے تبادلۂ خیالات کرو اور دیکھو لوگوں تک پیغام پہنچانے کے لئے تمہاری زبان کے سوا کوئی سفیر نہ ہونا چاہئے اور تمہارے چہرے کے سوا کوئی تمہارا دربان نہ ہونا چاہئے اور کسی ضرورتمند کو اپنی ملاقات سے محروم نہ کرنا''۔ (مکتوب ۶۷)

حاکم عادل کیلئے رعایہ کے حقوق وفرائض

امیرالمومنینؑ نے نہج البلاغہ میں اسلامی حکومت میں رہنے والی رعایا کے حقوق وفرائض پر بھی گرانقدر روشنی ڈالی ہے یقیناً اسلامی طرز حکومت میں رعایا کے بہت زیادہ حقوق وفرائض ہیں جنہیں سمجھے بغیر اسلامی طرز حکومت وسیاست کا صحیح خاکہ ذہن میں نہیں آسکتا۔ اس سلسلے کی سب سے بنیادی بات جو آپ نے ارشاد فرمائی ہے وہ یہ کہ ''اللہ کی معصیت کے ساتھ مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے'' (کلمات

قصار ۱۶۵) یعنی حاکم وقت کی اطاعت صرف اسی صورت میں ہے جب تک وہ اطاعت الٰہی کے دائرے سے تجاوز نہ کرے اور اگر کوئی حاکم حکم خدا کے خلاف کرنے کا حکم دے تو نہ صرف اس کی اطاعت کرنا حرام ہوگا بلکہ ایسے حاکم کا حکومت کرنے کا شرعی حق بھی ختم ہو جائے گا۔

مگر ایک حاکم عادل کے لئے امیرالمومنینؑ کے مطابق رعیت کا فرض اولین یہی ہے کہ وہ اس کی اطاعت کرے۔آپ نے یہی بات اہل مصر کے نام ایک خط میں تحریر کی ہے جب آپ نے مالک اشتر نخعی کو مصر کا حاکم بنایا:

''ان کی بات (مالک اشتر کی) کو سنو اور انکے ہر اس حکم کو جو حق کے مطابق ہو مانو کیونکہ وہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہیں جس کی نہ دھار کند ہوتی ہے اور نہ جس کا وار خالی جاتا ہے۔ اگر وہ تمہیں دشمنوں کی طرف بڑھنے کے لئے کہیں تو بڑھو اور ٹھہرنے کے لئے کہیں تو ٹھہرے رہو کیانکہ وہ میرے حکم کے بغیر نہ آگے بڑھیں گے نہ پیچھے ہٹیں گے''۔(مکتوب ۳۸)

دنیا کا کوئی بھی نظام بغیر نظم کے نہیں چل سکتا اسی لئے امیرالمومنینؑ نظم حکومت کو برقرار رکھنے کی خاطر حاکم کی اطاعت کو رعایا کے لئے لازم قرار دیتے ہیں مگر اس قید کے ساتھ کہ وہ حکم کے مطابق حق ہو۔ امیرالمومنین اس قید کو لگا کر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ امت کا حاکم ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رعایا اس کی جانب سے صادر ہونے والے ہر حکم کو فیصلۂ قضاء وقول سمجھتے ہوئے اس پر راضی ہوجائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ درباری علماء اور حکام کے آپسی گٹھ جوڑ نے عوام کو ہمیشہ یہ تاثر دیا کہ ظالم و جابر سلاطین کے لئے بھی بغاوت کی آواز بلند کرنا غلط اور غیر شرعی ہے۔ ان کے مطابق عوام کا فریضہ تو بس یہی ہے کہ حکومت کے سامنے ہر حال میں اپنے سر تسلیم کو خم کئے رہے تاکہ ظلم و ستم کی تاریک رات طویل سے طویل تر ہوتی چلی جائے اور حکومت کے خلاف کسی جانب سے کوئی تحریک پیدا نہ ہونے پائے۔ امیرالمؤمنین اپنے افکار کی روشنی میں اس نظریہ کی سختی سے مذمت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں چنانچہ آپ نے ایک مقام پر لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''دیکھو! اپنے ان سرداروں اور بڑوں کا اتباع کرنے سے ڈرو جو ذاتی جاہ وحشمت پر اکڑتے اور اپنے نسب کی بلندیوں پر غرہ کرتے ہوں اور بدنما چیزوں کو اللہ کے سر ڈال دیتے ہوں اور اس کی قضاء و قدر سے ٹکر لینے اور اس کی نعمتوں پر غلبہ پانے کے لئے اس کے احسانات سے یکسر انکار کر دیتے ہوں۔ یہی لوگ تو عصبیت کی عمارت کی گہری بنیاد، فتنہ وفساد کے ستون اور جاہلیت کے نسبی

تفاخر کی تلواریں ہیں۔ (ان) جھوٹے مدعیان اسلام کی پیروی نہ کرو کہ جن کا گندلا پانی تم اپنے صاف پانی میں سمو کر پیتے ہو، اور اپنی درستگی کے ساتھ ان کی خرابیوں کو خلط ملط کر لیتے ہو اور اپنے حق میں ان کے باطل کے لئے بھی راہ پیدا کر لیتے ہو وفسق و فجور کی بنیادیں ہیں اور نافرمانیوں کے ساتھ چسپیدہ ہیں"۔ (خطبہ ۱۹)

ان کلمات کی روشنی میں امیرالمومنینؑ کا نظریہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ باطل حکمرانوں کی اطاعت کرنا اسلامی شعار نہیں ہے کیونکہ ایسے حکمراں اپنے ساتھ ساتھ رعیت کو بھی گمراہی اور برائیوں کے دلدل میں گھسیٹ لے جاتے ہیں لہٰذا امیرالمومنینؑ ایسے حکمرانوں اور سرداروں کی اطاعت کرنے سے منع کرتے نظر آتے ہیں۔ درحقیقت اسلامی معاشرے میں حکمراں اور رعایا کے ایک دوسرے پر حقوق تبھی تک ہیں جب تک دونوں حدود الٰہی کا احترام کریں۔ اگر ایک ان حقوق کی انجام دہی میں کوتاہی کرے تو دوسرے پر اس کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ ہاں اس حکومت کا احترام اور اس کی قدر ضروری ہے جو رعایا سے کئے ہوئے اپنے وعدوں کو پورا کرنے میں کوشاں رہے، یوں بھی وفادار رعایا بھی حکومت کے لئے قابل احترام ہے۔ امیرالمومنینؑ نے ایک مقام پر اپنے اور رعایا کے حقوق اس طرح بیان کئے ہیں:

"اے لوگو ایک تو میرا تم پر حق ہے اور ایک تمہارا مجھ پر حق ہے۔ تمہارا مجھ پر یہ حق ہے کہ میں تمہاری خیر خواہی پیش نظر رکھوں اور بیت المال سے تمہیں پورا پورا حصہ دوں اور تمہیں تعلیم دوں تاکہ تم جاہل نہ رہو اور اس طرح تمہیں تہذیب سکھاؤں جس پر تم عمل کرو اور میرا تم پر یہ حق ہے کہ تم بیعت کی ذمہ داریوں کو پورا کرو، اور سامنے اور پسِ پشت خیر خواہی کرو، میں بلاؤں تو میری صدا پر لبیک کہو اور میں کوئی حکم دوں تو اس کی تعمیل کرو"۔ (خطبہ ۳۴)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: "آگاہ رہو! کہ تمہارا مجھ پر یہ حق ہے کہ اسرار جنگ کے علاوہ کوئی چیز تم سے پوشیدہ نہ رکھوں، شرعی حکم کے علاوہ کسی اور امر میں تمہارے مشورے سے پہلو تہی نہ کروں، تمہارے کسی بھی حق کو پورا کرنے میں تاخیر وکوتاہی نہ کروں اور اسے انجام تک پہنچائے بغیر دم نہ لوں نیز میری نگاہ میں تم سب کا حق برابر ہو۔ پس اگر میں نے ان تمام چیزوں کو جامۂ عمل پہنادیا تو تم پر خداوند عالم کی نعمت کا شکر واجب اور میری اطاعت لازم ہے۔ (میری) دعوت پر اپنے قدم پیچھے نہ ہٹاؤ اور نیک کاموں میں کوتاہی نہ کرو۔ اور حق تک رسائی کے لئے سختیوں اور دشواریوں سے ٹکرا جاؤ"۔

یہاں یہ بات دھیان دینے کے لائق ہے کہ امیر المؤمنین نے اپنی یعنی حکمراں کی اطاعت کو اپنے فرائض کی ادائیگی سے مشروط کیا ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ اسلام میں حاکم کی اطاعت رعایا پر تبھی واجب ہوتی ہے جب وہ اپنے فرائض پورے کرے اگر وہ اپنے جملہ فرائض میں سے کسی سے پہلوتہی کرتا ہے تو وہ رعایا کی اطاعت کا حقدار نہیں ہوسکتا۔

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق

عام طور پر دیگر مذاہب کے ماننے والوں میں یہی تصور پایا جاتا ہے کہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق نہ صرف یہ کہ محفوظ نہیں ہیں بلکہ سرے سے ہیں ہی نہیں۔ اس نظریئے کے لئے کچھ تو حقیقت ناشناسی اور کچھ مسلمان بادشاہوں کی غیر اسلامی روش ذمہ دار ہے۔ جو کچھ ظلم و زیادتیاں مسلمان حکمرانوں نے غیر مسلموں پر کیں اس کو لوگوں نے اسلام سمجھا حالانکہ اسلام وہ دین ہے جس میں دوسرے مذاہب کے لئے بہت گنجائش اور رواداری ہے قرآن مجید میں ایک مقام پر ارشاد ہے کہ دوسروں کے خداؤں کو برا نہ کہو، کہیں وہ پلٹ کر اللہ کو برا نہ کہیں۔ جس دین میں چوپایوں اور نباتات تک کے حقوق کا خیال رکھا گیا ہو وہ غیر مسلموں کے حقوق کو کیونکر پامال کرسکتا ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''لوگو! خدا کے بندوں اور اس کے شہروں کے معاملے میں تقویٰ اختیار کرو کیونکہ تم سے حتٰی زمین کے خطوں اور جانوروں کے سلسلے میں بھی سوال کیا جائے گا''۔

نہج البلاغہ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ امیر المومنینؑ اسلامی حکومت کی سرحدوں کے اندر غیر مسلموں کے حقوق ایک مسلمان کے حقوق کی ہی طرح محترم سمجھتے تھے اور رعیت سے مسلمان اور غیر مسلمان کی بنیاد پر کسی قسم کا بھید بھاؤ گوارا نہیں کرتے تھے۔ اسی لئے آپ نے اپنے ایک عامل کو لکھا:

''رعایا کے لئے اپنے قلب کے اندر رحم و کرم اور لطف و محبت کا جذبہ پیدا کرو اور ان کے حق میں پھاڑ کھانے والا درندہ نہ بن جاؤ کہ ان کے منھ سے نوالے چھینو کیونکہ اس میں دو طرح کے لوگ ہیں، ایک تمہارے دینی بھائی ہیں اور دوسرے خلقت میں تمہارے جیسے انسان یعنی انسانی بھائی ہیں''۔

یہاں امیر المومنینؑ صرف اسلام کی نہیں بلکہ انسانیت کی بات کر رہے ہیں یعنی اسلامی مملکت میں رہنے والے مسلمان اور غیر مسلم سب برابر کے حقوق رکھتے ہیں اور کسی بھی حاکم کے لئے جائز نہیں کہ

وہ غیر مسلم ہونے کے ناطے ان سے کسی بھی طرح کا غلط سلوک کرے۔ حاکم کا دائرہ عدل اتنا تنگ نہیں ہونا چاہئے کہ اس میں سوائے مسلمانوں کے کسی اور کے لئے گنجائش ہی نہ ہو۔ امیرالمومنین کے طرز حکومت سے تو ہمیں یہی تعلیم ملتی ہے۔ جب آپ کو یہ معلوم ہوا کہ معاویہ کے سپاہیوں نے ایک اسلامی شہر پر حملہ کر کے وہاں تباہ کاری پھیلائی تو آپ نے ایک خطبہ دیا اور فرمایا:

''مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ ان میں کا ایک شخص ایک مسلمان اور ایک ذمی عورت پر حملہ آور ہوا اور ان کے جسم سے پازیب، کڑا، گلوبند اور گوشوارے اتار کر لے گیا اور ان عورتوں کے پاس اس کو روکنے کا اس کے علاوہ کوئی ذریعہ نہ تھا کہ وہ گریہ و زاری کریں اور اس سے رحم کی بھیک مانگیں۔ پھر یہ لٹیرے لوگ سارا مال لے کر واپس چلے گئے نہ ان میں سے کسی کو کوئی زخم آیا اور نہ کسی کا خون بہا۔ پس اگر ایک مسلمان اس واقعے کے بعد رنج و اندوہ سے مرجائے تو اسے ملامت نہ کی جائے گی بلکہ میری نظر میں ایسا ہی ہونا بہتر ہے''۔

ان جملوں سے امیرالمومنین کے درد کو صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ آپ کی نظر میں رعایا کے طور پر ایک مسلمان اور ایک ذمّی عورت میں کوئی فرق نہیں ہے اور آپ ان پر ہوئے ظلم پر یکساں طور پر بے چین نظر آتے ہیں۔ آپ کے مطابق یہ مسلمان افواج کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلامی سرحدوں میں رہنے والے کفار کے جان و مال و آبرو کی اسی طرح حفاظت کریں جس طرح ایک مسلمان کی اور اگر وہ ایسا نہ کرسکیں تو انھیں رنج و اندوہ سے مرجانا چاہئے۔ یقیناً امیرالمومنینؑ کے یہ جملے ان لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں جو یہ رائے رکھتے ہیں کہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق محفوظ نہیں ہیں۔